سمیرا حمید

اور شاید اس سے ایک غلطی ہوئی کہ وہ اسے مٹھی میں دبا کر ساتھ لے آیا.... نہ سر سے اچھالا نہ پاؤں سے مسلا اور ہریالی کے سارے ٹھکانے جو اس کے اندر پیوست تھے' وہ چتا کی لکڑیوں کی طرح سلگنے لگے۔ اس

کے گھر کی روشنیاں کم سے کم ہوتی گئیں اور آخری وقت اسے دیواریں ٹٹول کر چلنا پڑا۔ یہ سب تین دن بعد ہوا اور تین دن پہلے دیواریں ٹٹولتے ہی وہ اس دہلی دروازے سے پار ہوا تھا۔ جن گلیوں میں وہ گھس آیا تھا۔ ان میں بہت اندھیرا تھا یا اسے ہی زیادہ روشنیوں میں رہنے کی عادت ہو چکی تھی کہ وہ ایک دیوار کا سہارا لے کر بھی لڑکھڑا گیا۔

اور یہ تیس سال بعد ہوا۔

یہ راز بہت بعد میں کھلا کہ یہ بھی کوئی راز ہی تھا۔

وہ آیا۔ وہ آئی۔۔۔ اور بس۔۔۔ اگرچہ بعد کے دنوں میں اس قصے کو نت نئے اندازوں سے سنایا گیا جیسے کہ کوئی لوک کتھا۔۔۔ جو ہر زبان پر پہنچ کر اس زبان والے کی من مرضی کی ہو جاتی ہے۔

پہلی بار اس نے ماں کو محرابی چوکھٹے میں کھڑے دیکھا اور اسے لگا راجپوتوں کی کوئی راج کماری دم بھر کے لیے سورج کو اپنا نظارہ کروا رہی ہے۔ وہ اس کی ایسی فیاضانہ ادا پر دم بخود رہ گیا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے ساتھ چلتے پھوپھی زاد طیب سے پوچھا۔

"یہ؟ ماں دیدی ہیں۔"

"ماں بھی اور دیدی بھی؟ ہیں کون۔ کس چچی، پھوپھی، خالہ، ممانی کی اولادیں دلیرانہ پروان چڑھی ہے کہ ایسے تصویر کی طرح محراب میں جڑی ہے۔ ایسی جرأت سے کسی بانکے کو کھڑے نہیں دیکھا کجا بانکی۔ میں یہ تنتنا سہن نہیں کر پا رہا۔"

"کوئی گناہ کر رہی ہیں کیا؟" طیب نے دانت نکالے۔

"گناہ کروا رہی ہیں۔۔۔"

"آپ کو تو عادت ہے، ہر لڑکی کے لیے گناہ سر پر لینے کی۔۔۔"

"اور تمہیں عادت ہے، میرے سارے گناہ یاد رکھنے کی۔۔۔"

"مشکل سے پانچ دن نہیں ہوئے آپ کو یہاں آئے ہوئے اور دو عدد خطوط میں آپ کے تکیے کے غلاف سے برآمد کر چکا ہوں اور ایک چھت کی مٹی سے۔ معاف کیجئے گا، ریشمی رومال کی آخری سطر میں نے بندہ نفس سے مجبور ہو کر پڑھ لی تھی۔ لگتا ہے محترمہ کے ابا حضور مشاعروں میں کثرت سے شرکت کرتے ہیں اور پھر گھر آ کر محفل جمانے کے شوقین ہیں اور میری ذہانت پر داد و تحسین عنایت فرمائیے، میں نے ان کے چوبارے سے جھانکتی ساری نسوانی بیلوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ یہی ہے وہ گھر جہاں سے مشاعرانہ رومال کا نزول ہوا ہے۔ بجا فرمایا نا میں نے؟"

"تم ذرا خاموش رہو۔۔۔" طیب کی آواز بار بار اسے الجھا رہی تھی۔

وہ چوکھٹے سے ہٹی۔ ستون کے ساتھ بل کھانے لگی اور اس بار نظر کرم اس نے آسمان پر کی اور اسے ایسے دیکھنے لگی جیسے وہاں سے کسی خاص مہمان کی آمد متوقع ہو۔ یعنی اسے زمین والوں سے کچھ لینا دینا ہی نہیں۔

عالی نے آہ بھری کہ یہ کیسی ناانصافی ہے۔

اور پھر جب وہ وہاں سے ہٹی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی روشنی اپنے اندر سموئے وہاں کھڑی تھی۔ یہ اندازہ بہت بعد میں بھی ہوا کہ وہ کیا کچھ لیے ہوئے تھی۔ کھڑی تھی، بیٹھی تھی، چلتی تھی، رکتی تھی، روک لیتی تھی اور ان سب کے ساتھ قائم بھی رہتی تھی، لیکن بہت کچھ تو ہلا ڈالتی تھی نا۔

شادی کا گھر تھا۔ لاکھ پردے کا اہتمام ہوا کرتا، لیکن آمنا سامنا ایسے تو ہو ہی جاتا کہ معلوم پڑتا بانکے بھی آئے ہیں اور بانکیاں بھی۔ سجیلے بھی ہیں اور سجیلیاں بھی۔ بانکی سجیلی وہ ڈھیر سارے کپڑے لپیٹے کبھی کسی بالکنی میں کھڑی دکھتی، کبھی کسی ستون سے لپٹی ملتی اور کبھی دالانوں سے فرشی سلام لیتی پائی جاتی اور وہ اتنا فارغ تھا کہ سارے ماموؤں، چچاؤں، چھوٹے بڑے ہر طرح کے اباؤں کی گھوریوں کو نظر انداز کرتا ان مندروں کی گھنٹیاں بجایا کرتا جن میں درشن کو وہ

میسر ہوتی۔

لیکن ایسے نہیں کہ نظریں چار ہو جائیں۔ بس کسی نہ کسی کی اوٹ سے۔ چھجوں اور کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر وہ اسے ان ستونوں' احاطوں' دالانوں میں صنف نازک کے جلوس میں علم بردار بنے دیکھتا۔ جہاں غراروں کی جانچ پڑتال ہو رہی ہوتی' کناریاں ٹنک رہی ہیں اور ہرے بھرے پتے سل بٹے پر رگڑ رگڑ کر منہ پر لیپے جا رہے ہوتے۔ وہ بھی آنکھ اٹھا کر اوپر دیکھ لیتی اور پھر اس کے کے قہقہوں پر وہ جی جان سے چڑ جاتا اور من ہی من میں کہہ اٹھتا۔

"اچھا جناب! تو ایسے باز نہیں آئیں گی آپ بھی۔"

"یہ کون ہے؟" طیب پھر سے پیچھے کھڑا دانت نکال رہا تھا اور وہ اس بار سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"کسی اور سے کیوں نہیں پوچھ لیتے... بلکہ ان ہی سے۔" طیب کی ہنسی معنی خیز تھی۔

"تمہیں کس دن کے لیے تیل پلایا ہے۔"

"لیکن یہ چراغ آپ کے ہاں کے تیل سے نہیں جلے گا..."

"کیوں؟" اسے انکار کی ساری ہی توجیہات بہت بری لگتی تھیں۔

"یہ تھالی اور سندور کی پرجاتی سے ہیں۔ پھوپھی اماں ان کی ماتا کی سہیلی ہیں۔ خاص دہلی سے لے کر آئی ہیں آپا رقیہ کی شادی کے لیے۔ دیکھ لیجیے بھائی صاحب! یہ ہندوستان نہیں جس کے ٹکڑے کر کے آپ کے ہاتھ آپ کا حصہ تھما دیا جائے گا۔"

"کم بخت! منہ سے خرافات ہی نکالنا۔" بڑے چچا کا گزر ہوا قریب سے تو طیب کی بات سے بھڑک اٹھے۔ "کیوں ہوں گے ٹکڑے... چل آ تیرے کروں ٹکڑے...."

بڑے چچا کانگریس کے حمایتی تھے۔ مزاج اتنا بگڑا کہ طیب کو حلوائی کے ساتھ سامان اٹھوانے میں لگا دیا جو بے چارا پھوپھی اور پھوپھیریوں کے دوپٹے رنگوانے جاتے سو سو بہانے بناتا تھا کہ ہم سے نہیں ہوتا اتنا کام۔

سفید اونچی دیواروں سے رنگین آنچل ٹکرایا کرتے تو دم بھر کو اسے لگتا کہ اڑتا ہوا یہ آنچل اس کے ہاتھ آیا کہ آیا۔

بالائی منزل میں موجود بلکہ قید مردانے میں دم سادھ لیا جاتا جب نت نئے راگ ڈھولک پر گائے جاتے۔ آگرے کے پھوپھا حقہ گڑگڑاتے گاؤ تکیے کو سہارا بنائے ذرا کی ذرا چونکے۔

"یہ کون گا رہا ہے؟" سرگوشی کی طیب کے کان میں' مبادا کوئی یہ جان نہ لے کر وہ ایسے کان لگا کر سن رہے ہیں۔

"وہی جن کے لیے آپ کہتے ہیں' گھٹی میں ناچ گانا چاٹتے ہیں۔"

"اچھا تب ہی۔"

حقے گڑگڑاتے' پان چباتے' حیدر آبادی چٹکلے چھوڑتے مردانے کے سب مرد سو جاتے تو وہ چپکے سے ابا سے نظر بچا کر جو آنکھیں تو موند لیتے پھر بھی اوں آں کرتے رہتے۔ اوپر چھت پر آجاتا اور نیچے چلمن پوش دالانوں کو جو انگیٹھیوں سے دہک رہی ہوتیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا۔ جو دکھائی دیتا وہ سنائی نہ دیتا۔ وہ نیچے آتا سنتا اور پھر دیکھنے کے لیے اوپر پہنچ جاتا۔

"یہ ٹھمری ہے... گیت... کہ بھجن...."

وہ سنتا جاتا' سوچتا جاتا۔ پھر دبے پاؤں نیچے آتا اور سوچتا کہ سب تو ڈھولک کے گرد بیٹھی ہیں۔ کہیں سے کسی کونے میں گھس جائے اور دیکھے کہ قریب سے دکھتا کیسا ہے۔

"تم سوئے نہیں ابھی تلک؟" کوئی نہ کوئی بوا' چچی' ماسی سر نکال پوچھتی۔

"یہ ماسیاں' چچیاں' بوائیں اتنی زیادہ کیوں ہوتی ہیں۔ ہوتی بھی ہیں تو جلد سوتی کیوں نہیں۔ بلیوں کی طرح کہیں سے بھی میاؤں کر دیتی ہیں۔"

"کان میں درد ہے۔ تیل لینے آیا ہوں۔ اماں جی کہاں ہیں؟"

"اماں تو سو گئی تمہاری۔ کان میں درد ہے تو بچے ہو کیا جو تیل ڈالو گے۔۔۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔"

"درد میں نیند کسے آتی ہے۔۔۔ درد دینے والوں کو ہی آتی ہوگی۔۔۔ سہنے والوں کو تو نہیں۔۔۔" اس نے ذرا سر کو اٹھا کر کہا کہ کوئی تو سن لے۔

اور سن لیا گیا کہ چلمن کے پار ڈھولک پر تھاپ رک گئی۔ گانے والی کی آواز بھی۔

"کون دکھیارا راگ الاپ رہا ہے موسی؟" ڈھیروں کپڑوں میں لپٹی نے ڈھیروں کانچ سے سجے ہاتھ کو جسے آج ہی مہندی سے رنگا تھا۔ ادھر موسی کی طرف اٹھا کر پوچھا۔

"گیت گانے والیاں کیا گیت ہی بولتی ہیں؟" چلمن سے اس نے اس کی مسکراتی آنکھوں کو دیکھ کر سوچا۔

باقی لڑکیاں ہنسی سے دہری ہونے لگیں اور اس کو اس کی جرأت پر داد دینے لگیں۔

"اب کیا تیل کے لیے بھی وائسرائے کے پاس جاویں اور کہویں۔" وہ بوا سے چڑ گیا۔

"ٹھہرو' لاتی ہوں پر کہے دے رہی ہوں۔ دوبارہ کان میں درد لے کر نہ آنا۔ تین دن سے یہ درد لیے تمہیں آتے اور جاتے دیکھ رہے ہیں بابو۔! تمہاری اماں کے کان میں بات ڈال دی ہے۔ اب ذرا صبری سے رہو۔ کل پوچھا تو کہہ رہی تھیں۔ ابھی نہیں کروں گی اس کی ہکام وام تو کوئی کرتا نہیں۔"

بوا نے ایسا کوئی چٹکلا تو نہیں چھوڑا تھا' لیکن ڈھولکی کی ساری پلٹن ہنس ہنس کر ادھ موئی ہوگئی۔

اگلے دن ناشتا ملا' نہانے کا سامان اور اعلان بھی کہ "تیل ماچس رکھوادی گئی ہے کمرے میں۔ راتوں کو نیچے آنے کی زحمت نہ کیجیے۔ ٹھنڈ لگ گئی تو ہم سے تیمارداری نہ ہوگی۔"

ہونہہ اسے کیا ضرورت تھی نیچے آنے کی۔ اتنا تو اب اس نے کر ہی لیا تھا کہ تین اطراف کی چھت کو گھوم پھر کر اس نے وہ سارے کونے تلاش کر لیے تھے جہاں سے گیت بولنے والی دکھائی دیتی تھی۔ سنہری دھوپ میں جھولا جھولنے والی' پان کی گلوری دکھا دکھا کر کھانے والی' سر نیہوڑائے پیروں کے ناخنوں پر مہندی لگانے والی' کسی ریشمی جھلمل کو سر پر اوڑھتی ہوئی۔ اور سر اٹھا کر چھت کے کسی کونے کی درز کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر اور پھر "اچھا بچو! تو یہ آپ ہیں۔" آنکھوں میں سمو کر بھر بھر اچھالنے والی۔

☆ ☆ ☆

اوپر کہیں سے کچھ آ کر گرا۔ تلملا کر اس نے سر اٹھایا اور گندی سندی دیواروں' کھڑکیوں' چھجوں کو گھور کر رہ گیا' لیکن کچھ بھی قابل ثبوت نہ ملا کہ کس نے سر نکال کر یہ حرکت کی۔ کراہیت سے وہ جل بھن گیا۔ یہ تھوک تھا جو اس کی پیشانی پر پڑا تھا۔ رومال سے پیشانی رگڑتے اس کے اندر ابال آیا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ اب تک تو اس نے کبھی رتی برابر بھی یہ کوشش نہیں کی تھی کہ ٹوٹے بکھرے قافلوں کی صورت ہجرت پر نکلے خاندان کو پالے۔ وہ رنگین برتنوں کا دلدادہ تھا۔ باسی پن سے اسے اکتاہٹ ہوتی تھی۔ اماں' ابا ہجرت سے دعا کرتے۔ بہت جلد اپنی روحیں لیے اس پار جا پہنچے اور ہجرت سے باغی ہوئے۔ پھر یہاں آئے ہی کیوں تھے۔ چند بار اسے خطوط ملے کہ میں تمہارا فلاں ابن فلاں ہوں اور تم میرے فلاں ابن فلاں لگتے ہو۔

"تو میں کیا کروں؟" وہ خط کو کہیں بھی اچھال دیتا۔

جو حویلی اس نے ان دنوں اپنے نام الاٹ کروالی تھی وہ اسے ہوٹل بنانے میں مصروف تھا۔ اب وہ اس کی دیکھ ریکھ کرتا یا ان فلاں ابن فلانوں کی۔ ویسے بھی پرانا دستور جو بھی ہوا کرے' وہ تو نیا دستور رقم کر رہا تھا۔

کیسا خوب صورت دستور رہا تھا شادی کے گھر آنگن میں مہینوں پہلے قافلوں کے اترنے کا۔ علی گڑھ سے کچھ اور مہمان آرہے تھے۔ مردانے کو ذرا خالی کروایا گیا اور لڑکیاں آئیں بستر اور جانے کیا کیا اٹھا کر اوپر رکھنے۔ وہ عین وقت پر پردے کے پیچھے کمال مہارت سے چھپ گیا۔ اوپر سے نیچے جھانکتے پہلے ہی تاڑ گیا تھا کہ بانکھوں کی آمد اوپر متوقع ہے۔

اور پھر جب صاف شیشوں کی لالٹینیں رکھ دی

گئیں۔ انگیٹھیوں کی پرانی راکھ کو کوئلوں سے بدل دیا گیا اور طاقوں کو چراغوں سے سجایا گیا تو وہ یہاں وہاں اپنے ڈھیروں کپڑوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتی گلاب پاش سے فضا کو معطر کرتی پیچھے جاتے جاتے رہ گئی۔ باقی سب جا چکی تھیں' ایک اسی کا کام رہ گیا تھا۔

وہ اوٹ سے نکل آیا اور وہ گلاب پاشی کرتی ایڑی کے بل گھومتی اس کے سینے سے آ لگی۔۔۔

"اوئی ماں!" اس کے منہ میں ہی رہ گیا۔ ذہن وا ہوا اور آنکھوں نے پہچان سے کچھ یوں کہا۔ "اچھا بچو! تو یہ آپ ہیں۔"

"کیوں نا ہوتا!" اس نے لفظ لفظ کہا۔ آواز سے کہا کہ یاد تھا وہ کس تفاخر کو لیے پہلی بار کیا پائی گئی تھی۔

تفاخر نہ ہی اس کے ہونٹ کچھ کہنے پر مائل ہوئے' لیکن پھر آخر کار وہ ان پر تبسم لے آئی۔۔۔

"مجھے عالی جاہ کہتے ہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر پیشانی تک لے جا کر کہا۔ کتنی ہی بار سوتے جاگتے یہ دہرا چکا تھا۔

نام سن کر گلاب پاش کو اس نے اس کے شانوں کے کنارے سے پرے لہرایا اور پھر گلاب پاش کو دونوں ہتھیلیوں میں سمو کر ہاتھ جوڑ لیے ذرا سا پیچھے ہوئی' ذرا سا جھکی اور کہا۔

"پرنام۔ مجھے مانیکا کہتے ہیں۔۔۔ مان بھی کہا جاتا ہے۔ پرنام کہتی ہوں۔۔۔ چرن چھوانے کی اوشکتا (ضرورت) تو نہیں ہو گی۔"

آنکھوں کی کمانوں کو اس نے ایسے اٹھایا' مانو جیسے اس کی حالت کا نظارہ کرنے کو اس کا دل مچلا جا رہا ہو اور وہ بھی اس کی مشق کرتی رہی ہو کہ جو درزیں ڈھونڈ ڈھانڈ تانکا جھانکی کرتا ہے' وہ جب جواب میں پرنام پائے گا تو کیسے مچل کر تڑپ جائے گا۔ اور ایسا ہوا بھی لیکن پھر وہ اس کے چونک کر ادھ موا ہو جانے پر آن کے آن دل شکستہ سی ہو گئی۔

"مانیکا!" عالی جاہ نے ایسے صدمے سے کراہ کر کہا جیسے اس کی روح کے باغات کو لوبان کی دھونی دی جانے لگی ہو اور اس اطلاع نے اسے رقص بسمل کی سزا سنائی ہو۔

مانیکا نے زمین سے چھوتی اپنی چولی' چنر کو اٹھانے کی زحمت کیے بنا ان سے الجھتے ہی بھاگ جانا چاہا اور وہ یہ کر گئی' لیکن صدمے کا اثر کچھ ساتھ لے گئی۔ کچھ چھوڑ گئی۔

سلام اور پرنام میں ربط گلاب پاش کی موجودگی میں بھی پنپ نہ سکا۔

رات نئے مہمانوں نے جم کر ڈھولک بجائی پھر بھی رات سونی رہی۔ نہ ملن کے گیت جاگے نہ ارمان آہ بنے۔

رات میں بن باس پنپنے لگا۔

وہ پھر نیچے آیا۔

"تیل تیلی رکھوا دی ہے تمہارے کمرے میں۔" بوا شاید ہنسی تھیں کہ کانوں کے بالے جھومنے لگے۔

"سر میں درد ہے' کچھ کیجیے۔۔۔"

"اب سر کو کیا ہوا؟ اور کیا کروں میں۔ جاؤ' اپنی اماں سے کہو۔ وہ وہاں محفل جمی ہے ان کی۔ اور سنو بابو! پہلے سلام کر لینا سب بڑوں کو۔ یہاں سب کو تم سے شکایت ہے کہ تم ٹھیک سے آپ جناب نہیں کرتے۔"

"کہیں تو پیر بھی چھو آؤں؟"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اماں پتا نہیں کس کس کے ساتھ لمبی باتوں کے سفر پر نکلی تھیں۔ وہ ایک نظر ادھر دیکھ کر اوپر آ گیا۔

"چرن چھوانے کی اوشکتا تو نہیں ہو گی۔" رات بھر یہی منتر اسے بہلاتا رہا اور دالانوں' بالکنیوں کے کونے بدلتے دن میں وہ اس منتر کو آنکھوں سے پھونکتا رہا۔ نیچے وہ خود کو چھپاتی رہی' نہ مسکرائی اٹھلائی' نہ چنر میں نہ چولی میں جھلملا کر نہ اترا کر۔

دن میں آس پنپنے لگی۔

شام کو لالٹین اٹھانے اور نئی رکھنے آئی۔ مرد سب احاطے میں تھے۔ قوالی شروع ہونے والی تھی۔ طیب کو اس نے چوکیداری پر لگایا تھا۔ اور وہ مرا جا رہا تھا سیٹی مارنے کے لیے اس سے پہلے کہ انہیں ہی گردن سے

پکڑ کر مار دیا جائے۔ وہ چھت پر آگیا جہاں سے بالائی منزل یہ سامنے ہی دکھائی پڑتی تھی۔

ململ کے کپڑے سے اس نے کھڑے کھڑے چند لالٹینوں کے شیشے اندر سے صاف کیے اور ان میں تیل ڈالتی انہیں روشن کرتی رہی۔

شام گہری ہونے کو تھی اور روشنیوں کا سامان کردیا گیا تھا۔

آٹھ دس لڑکیاں اتنے سے کام کے لیے جانے کیوں دیری کررہی تھیں۔ ہنسی ٹھٹھول کے لیے کیا ہی جگہ اور وقت ملا تھا۔ اب بوا کہاں ہیں۔ خبر کیوں نہیں لیتیں کہ لڑکیاں رنگین جھلمل اوڑھنیاں اوڑھے نینوں میں کاجل بٹھائے مردانے میں صرف تیل بدلتے وقت کا اتنا ضیاع کررہی ہیں۔

بہت دیر گزری۔ بوا جاگ ہی گئیں اور ان کی للکار پر کچھ جھٹ پٹ نیچے بھاگ گئیں۔ کچھ نے کانوں میں تیل ڈال لیا اور للکار کو نظرانداز کردیا۔ اتنا ہی کافی تھا۔

وہ مردانہ چال کی آواز پیدا کرتا نیچے اترا تو جو بچی تھیں وہ بھی کھسک گئیں۔ وہ لالٹین کی لاٹ کو بلاوجہ ٹھیک کرنے لگی۔ تو اب وہ آہٹ پہچان گئی تھی۔ اس کا انداز دل ربانہ تھا اور محبوبانہ بھی۔ لیکن ایسا نہیں کہ کچھ طے پاجائے یا وہ کچھ طے کربھی لے گی۔ اسے یاد تھا کہ سندور ریکھا کے عین نیچے بندیا چمک رہی ہے۔

"روشنی ہوگی یا نہیں۔ کیسا دل کو آلینے والا اندھیرا چھایا ہے۔ میں ایسے اندھیرے میں کیسے جیوں بھلا اب۔"

عالی جاہ نے بات کی اور ساری بات کہہ دی۔

سوال کے جواب کے لیے وہ ذرا ٹھہری اور رخ موڑے بنا دیا سلائی روشن کی اور پھر پھونک مار کر بجھادی۔ اور اس نے تو داستان ہی کہہ دی۔

جس جاہ اور طمطراق سے وہ نیچے آیا تھا اور کئی گھنٹوں سے اوپر ٹہل رہا تھا وہ سب پہلی رات کی سہاگن کی بیوگی کے جوگ میں لپٹ گئے۔ طیب نے سیٹی ماری۔ نہ بھی مارتا تو اسے جانا ہی تھا۔ لیکن وہ رک گیا۔ اس سے سہن نہیں ہورہا تھا۔

"پھر اندھیرا ہی۔ ہاں؟" اس کی پشت کو دیکھتے جس پر اس کے بال جوگی کی من سادھنا جاپ کرنے کو تھے دیکھتے ہوئے کچھ کہا کچھ جتایا۔

اور ایسے ہوا کہ رخ کو اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور جو بندیا دونینوں کے بیچ چوکیدار بنی گڑی تھی' وہ کسی کام کی نہ رہی۔ سارا مان سمان' جاہ و جلال کی نذر ہوگیا۔ کچھ وقت نہ لگا۔ دوسری دیا سلائی روشن ہوئی اور تازہ تازہ صاف کی گئی لالٹین روشن ہوگئی۔

طیب سیٹیاں مار مار کر ہلکان ہوگیا اور ایک نہ دو کتنے ہی مہمان مردانے کی طرف آئے۔ وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر لے گیا اور دور سے آتی قوالی کی آواز نے نہ معلوم کیسا سماں باندھا کہ اس کے ہاتھ کی روشن لالٹین کی گواہی میں دو دلوں نے یکساں حال کھیلا۔

اور "دو" کا ہندسہ "تہمت زدہ" ہے۔

۞ ۞ ۞

وہ دو گڈیاں رکھ کر لایا تھا جیب میں۔ وہ یہ طیب کو دے دے گا۔ مہینہ پہلے دور کے کوئی رشتے دار اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اپنا کوئی کام نکلوانے اس کے پاس آئے تو باتوں باتوں میں طیب کا ذکر نکل آیا۔

"ایک ٹانگ سے اپاہج ہوگیا تھا ہجرت میں۔ پہلے تو کئی کئی دن کا فاقہ رہتا تھا اب بیوی اور بچیوں نے کچھ سلائی بنائی کا کام شروع کیا ہے تو روٹی میسر ہے۔ دیوانی بہن اور تین بچیوں کے ساتھ غربت جھیل رہا ہے۔"

"صغری دیوانی ہوگئی۔" اسے ننھی صغری یاد آئی اور پھر وہ سارے کام چھوڑ کر طیب کی طرف آنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ ایک طیب ہی تھا جسے اس نے تھوڑا بہت تلاشنے کی کوشش کی تھی۔

گلیاں جتنی تنگ ہوتی جارہی تھیں۔ اتنی ہی مدفن اور تعفن زدہ ثابت ہوتی جارہی تھیں۔ دور سے بینڈ باجے کی آواز آرہی تھی جو قریب آتی گئی۔ گلی تنگ ہوگئی اور جب تک بارات آگے نہیں نکل گئی' وہ پھنس کر کھڑا رہا۔ شادی والے گھر کے آگے سے گزرا

تو ایک نظر گھر کے اندر بھی ڈال لی۔

شادی کے گھر میں دن ایسے پھسلے جیسے آسمان سے مینہ پھسلتا ہے، دھن دھنا دھن۔ شراروں میں لپٹی لڑکیاں گیت مالا بن گئیں۔ منکے پر منکہ گرا اور زندگی کی سیج پر ایک مالا پرو گیا۔ ماں اور عالی کی یک جوڑ مالا۔

وہ دہلی سے تھی اور وہ بھی سارے راستے ملب آیا تھا۔ کتنے ہی ملنے والے دور کے "نزدیک کے" سگے سوتیلے وہاں رہتے تھے۔ ہاں بس اسے ذرا ڈھیٹ ہونا پڑا کہ جب یہ نوبت آجاتی کہ بس ہاتھ پکڑ کر نکالنے کی کسر رہ جاتی تو وہ واپس حیدر آباد آجاتا۔ ابا سے دو جوتے کھاتا اور سو جھوٹ سچ بولتا کہ کہاں تھا اور کیا کرتا رہا۔

دو سگائیاں اس نے تڑوا دی تھیں۔ ایک موذی بیماری کا ڈھونگ رچا کر اور ایک بے شرم بن کر لڑکے سے خود کہہ کر۔ گھر والوں کو بھنک نہیں تھی کہ وجہ کیا ہے۔ وہ روز مندر جاتی تھی اگر وہ ذرا رکھوالی کرتے تو جان جاتے کہ مندر کے نام پر کون سی "پوجا" ہو رہی ہے۔ مندر کے "نبھانے" زیادہ ہو جاتے تو وہ عالی کی دور کی خالہ زاد جو اس کی سہیلی بھی تھی کی طرف آجاتی اور اس کا برقع لے کر نکل جاتی۔ عذرا کو اس نے خبر نہیں ہونے دی تھی۔ ویسے وہ اس کی سانس کے سنگ سنگ تھی لیکن عالی جاہ کے مقام سے وہ پردہ نہیں اٹھا سکی۔ اسے پہلی بار یہ دھڑکا لگا کہ یہاں عذرا کی محبت مات کھا جائے گی۔ وہم حقیقت میں نہ بدل جائے، اس نے آزمائش سے دور ہی رکھا۔ اور پھر عالی جاہ بھی یہی چاہتا تھا۔

دونوں پرانے قلعوں میں بیگم اور صاحب بن کر گھومتے رہتے۔ بازاروں سے گھر دار بن کر خریداری کرتے۔ باغوں سے اپنے بالمچھوں کے لیے پھول توڑتے۔ وہ چولیوں اور ساڑھیوں میں اس کی پسند کے رنگ لیتی اور مانگ نکال کر اس کے نام کا ان دیکھا سندور بھرتی اور اس کے نام پر برت رکھنے لگی۔ سب یوں ہی ہونے دیا گیا۔

سب گھر ایک جیسے تھے۔ وہ تین بار غلط جگہ دستک دے چکا تھا۔ اسے اشتعال آیا کہ وہ آخر یہاں آیا ہی کیوں ہے۔ کیا کرلے گا اب وہ طیب سے مل کر۔ کیا ضرورت تھی اتنا جذباتی ہونے کی۔ اس نے چاہا کہ وہ واپس پلٹ جائے لیکن پھر بھی وہ آگے بڑھتا رہا کہ اس مجمعے سے بمشکل جگہ بنا کر گزرا جو آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے اور چھا خاصا فساد برپا کر رکھا تھا۔

فسادات کی خبریں جو دور دور تھیں، وہ نزدیک تر آتی گئیں۔ جو کل تک اس شہر اور اس گلی تک کی بات تھی، اب وہ ساتھ والی گلی اور ساتھ والے گھروں تک آگئی۔ مرنے والوں کی خبریں دال سبزی کے بھاؤ کی طرح عام ہو گئیں۔

جو خط ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھے جاتے، وہ اس تک پہنچ ہی نہ پائے۔ لیکن چند ایک خط جو اس نے طیب کے ذریعے عالی تک پہنچائے جو عذرا کے یہاں اپنا خاندان لے کر آچکے تھے، وہ تو اسے ضرور ملے ہوں گے۔ وہ آس اور امید سے زیادہ پراتھنا پر یقین کر بیٹھی تھی۔ گھر والوں کو اس نے الوداعی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ماتا جی کو وہ بار بار چومتی تھی اور گاہے بگاہے ہاتھ جوڑ جوڑ کر شما (معافی) مانگا کرتی۔

عالی اپنا خاندان سرحد پار کروا آیا تھا لیکن دوسری بار پھر اس پار آگیا تھا۔ وہ بنا کسی کو بتائے آیا تھا ورنہ اماں کبھی نہ آنے دیتیں۔ پاکستان کیمپ میں چند دنوں کے قیام سے وہ تاڑ گیا تھا کہ نئے نئے بنے اس ملک میں اب پیسے والے ہی انسان کہلائیں گے۔ خود کو انسانوں میں شمار کروانے وہ اس پوٹلی کو لینے واپس آیا تھا جو وہ آبائی گھر کی زمین میں دبا آئے تھے۔

واپسی میں کیمپ میں بوسیدہ کپڑوں میں وہ نظر آئی تو وہ ہولے ہولے اس کی شکل کو اکٹھا کر سکا۔

"عالی!" وہ اس کا نام یاد کرنے کی کوشش میں نہیں بھی تھا تو بھی وہ اس سے لپٹ گئی اور اسے سب یاد کروا دیا۔

"ماں۔ تم یہاں۔" اسے اتنا سا جملہ بولنے میں کافی دقت ہوئی۔ اس کے حواس یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھے کہ اس کے سامنے وہی ہے۔

"ہاں۔ میں تمہارے گھر بھی گئی تھی، وہاں اور

لوگ آگئے ہیں۔ مجھے پتا تھا تم ضرور آؤ گے۔"
"تم گھر سے بھاگ آئی ہو؟"
"نہیں' بھاگی تو نہیں۔ سدھار آئی ہوں۔ کتنی منت کی تمہاری کہ مت جانا۔ جانا تو مجھے لے کر جانا۔ عذرا کا پیغام ملا کہ تم پاکستان پہنچ چکے ہو۔ میں جانتی تھی تم مجھے لینے ضرور آؤ گے۔"
"مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔"
"کیسے ملتا۔ لیکن تم آئے بھی نہیں لینے۔ میں یہاں آگئی۔ تم نہ آتے تو پاکستان آجاتی۔"
"ماں! تم پاکستان جارہی ہو؟ ماں! تمہاری جاتی نے چچا قدوس کو زندہ جلا..."
"ہے رام۔ میں دیکھ رہی ہوں سب۔"
"اب سب الگ ہو گیا ہے ماں!"
"اسی لیے تو آئی ہوں کہ ہم الگ نہ ہوں۔"
"تمہارا دین' دھرم تو الگ ہے۔"
"دھرم۔ دھرم کی بات پہلے تو نہیں کی۔"
"میں سب یہاں چھوڑے جارہا ہوں۔ کچھ نہیں لے کر جانا مجھے یہاں سے۔"
"تم بھی تو یہاں گے ہی ہو۔ پھر خود کو کیوں لے جارہے ہو۔"
"تمہاری وہاں کوئی جگہ نہیں ہوگی ماں! میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔"
"میں کسی زمین پر رہنے نہیں جارہی۔ تمہارے ہوتے ایسا کیسے کروں گی۔"
"تم یہاں آئیں ہی کیوں؟ کچھ نہیں سوچا کیا؟"
"سوچا! تمہیں سوچا۔ تم مجھے چھوڑنا چاہتے ہو؟"
"میں تمہیں تکلیف سے بچانا چاہتا ہوں۔"
"تمہارے ساتھ میں کس تکلیف میں ہو سکتی ہوں؟ یاد کرو' رقیہ کی شادی میں تم نے کہا تھا "موت کی حقیقت تم پر میری جدائی سے کھلے گی۔" میں تم پر یہ حقیقت نہیں کھول سکتی عالی۔" وہ خاموش رہا۔
"کہ دو تو میں لوٹ جاؤں۔" یہ کہتے اس کی آواز میں مرتے ہوئے

مردہ پرندہ کی ا... تھی تب ہی وہ ساری کی ساری اس سے لپٹ گئی کہ وہ کہے گوٹ جاؤ تو وہ دم توڑ دے اور اسی میں

لوٹ جائے۔

اور ایسے پر آشوب وقت میں، کیمپ کے خون آشام اندھیرے میں ہجرتی قافلے کے مسافر نے اپنے اندر غیرت کو اڑتے محسوس کیا اور وہ یہ گوارا نہ کرسکا کہ جو گھر سے خود ہی سدھار آئی ہے، اسے یہ بتادے کہ وہ اس کے لیے نجمہ تھی، حلیمہ تھی، اختر تھی، مہر النساء تھی۔ محبت اس کی خصلت تھی بس۔ وہ تو پہلے دن سے ہی جانتا تھا کہ وہ مانیکا ہے۔ پوجا کی تھالی اور سندور کی پرجاتی سے۔ اور خصلتوں کو پرجاتیوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔

زخمیوں کے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ مائیں مر گئی تھیں، ان کے شیر خوار دودھ کے لیے تڑپ رہے تھے۔ تیرہ چودہ سال کی دو لڑکیاں سر پر ہاتھ رکھے ہچکیاں لے رہی تھیں۔ ایک کپکپاتا جھکی کمر کا بوڑھا کیمپ میں رینگ رینگ کر چلتے غفور، غفور کی صدائیں لگا رہا تھا۔

پھر بھی وہ خود کو نیچا دکھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک عورت کو کیونکر کہہ دیتا کہ "اس نے سب سچ بولا تھا جو اب جھوٹ ہو گیا ہے۔ جاؤ لوٹ جاؤ۔ ہمارا تمہارا بس یہیں تک کا یارانہ تھا۔"

اپنی حقیقی ذات کے اہرام کو کیونکر ایک عورت کے سامنے ملیامیٹ کردیتا۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" خاموشی نے عجیب کام کیا، مان کی چہکار لوٹ آئی۔ اس سب پر بھی کہ ذرا فاصلے پر ایک جوان دیہاتن بیوہ اپنے بال نوچ نوچ کر بین کررہی تھی۔ "دیکھو، میرے کپڑے کیسے تار تار ہو گئے ہیں۔ شرم آتی ہے اب تو۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"اماں کے زیور۔"

"اماں جی کے زیور۔ ایسا ویسا اتنا کچھ دیکھ لیا ہے۔ لاؤ، کچھ اچھا بھی دیکھ لیں۔"

وہ تھیلے میں سے پوٹلی کھول کر دیکھنے لگی۔ شاہدہ رخسانہ کے لیے زیور الگ کردیے۔ چھوٹے آزاد اور بڑے اقبال کی دلہنوں کے لیے بھی۔

"اور یہ میرے ہوئے۔ عالی جاہ کی دلہن کے لیے بھی۔" پھر یوں مسکرانے لگی جیسے اس کی ساس نے اسے شگن چڑھایا ہو۔

"دیکھو عالی! برا نہ مانو تو ان میں کوئی ایک زیور مجھے پہنادو۔ میرا دل لرزتا ہے، یوں یہ اچھا شگون ہو جائے گا۔ ماتا جی کہتی ہیں۔ شگن لیکھ کو چڑھاوا ہے مانو پھر تو لیکھ بھی نہیں بدلتے۔ لجا کرتے ہیں۔"

اس نے ناک کی بالی کو کان کے سوراخ میں پرو دیا اور وہ ایسے خوش ہو گئی جیسے اس کی مانگ میں سندور بھر دیا گیا۔

"میری آتما کو اب قرار ہے عالی۔ میں کیسے کیسے نہیں ڈرتی تھی لیکن اب قرار ہے۔"

اس قرار کو لیے وہ گہری نیند سو گئی تو وہ پوٹلی کو اس کے پہلو سے نکال کر چلا آیا۔ کہ جاؤ بس لوٹ جاؤ۔

بوسیدہ دروازے پر جھولتی زنگ آلود زنجیر کو اس نے اخلاقاً "بجایا ورنہ دروازہ وا تھا اور کٹا پھٹا پردہ چور کو بھی کان لپیٹ کر پلٹ جانے کا سندیسہ دے رہا تھا۔

"آجائیے!" مردانہ آواز جو اس نے پہچان لی، طیب کی تھی، وہ اندر چلا گیا۔ اس کی آنکھیں قبل از وقت نم ہو گئیں اور سینہ طیب کو بھینچ لینے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

اندر جاتے ہی روشنی اور کم ہو گئی اور یک دم اسے دیوار کا سہارا لینا پڑا۔

طیب اتنا سرد ملا جیسے خون اس کی رگوں میں ہمالیہ سے بہہ کر آتا ہو۔ اسے حیرت ہوئی۔ پھر خیال آیا کہ نوٹوں کی جو گڈیاں اس کی جیب میں موجود ہیں، وہ شاید اسے تھوڑا گرم کردیں۔ جو بھی تھا۔ اسے دھچکا لگا۔ اس کی بیوی اور تینوں بچیاں اسے بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہیں جیسے وہ کسی جنگل کا وحشی ہو اسے کوفت ہوئی، لیکن چھپا گیا۔

"تم نے کبھی مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی طیب؟" یہ سوال وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا اور پوچھ بھی لیا۔

"کیوں نہیں، اور تم ملے بھی۔ ایک خط بھی لکھا

کبھی کوئی جواب نہیں آیا۔ سوچا پتا ٹھیک نہیں ہو گا۔" اس نے پتا ٹھیک نہیں ہو گا ایسے کہا جیسے گھر کے پتے کی بات نہ کر رہا ہو۔

"خط!" وہ چونک گیا۔ وہ فلاں ابن فلاں کے خطوط سے اتنا عاجز تھا کہ اپنے سیکریٹری کو کہہ رکھا تھا "ایسے ہر خط کو پھاڑ کر پھینک دیا کریں۔ میرا وقت برباد نہ کیا کریں۔

"مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ اگر ملتا تو میں بہت پہلے تم سے ملنے چلا آتا۔"

طیب خاموش رہا اور اس کی بیوی بھی خاموش رہی' اس کی تینوں بیٹیاں بھی۔ پر اتنی خاموشی میں بھی کوئی تو بولتا رہا۔

اسے طیب کے ایسے غیر جذباتی پن نے صدمہ دیا اور جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکالنے کا ارادہ اس نے ترک کر دیا۔ اسے معمولی ہی سہی لیکن دکھ ہوا کہ کیسے طیب جو اسے آپ کہا کرتا تھا 'اب تم پر آ گیا ہے۔

"صغریٰ کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ دیوانی ہو گئی ہے۔ تم نے اس کا علاج نہیں کروایا؟" اس نے طنزاً" کہا۔ وہ اس کی غربت کا مذاق اڑانے پر آ گیا تھا۔

"صغریٰ!" طیب چونکا جیسے اس کا دل مٹھی میں آ گیا۔ "میری صغریٰ! اس نے تو میرے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔"

"تو پھر بانو ہے؟" اب کی بار وہ پھونکار رہ گیا۔

"بانو تو کیمپ میں ہی اماں ابا کے دکھ میں چل بسی تھی۔"

کچھ وقت ایسے ہی سرک گیا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا جانے کے لیے اور ابھی وہ دروازے تک پہنچا تھا کہ طیب کی سسکتی آواز اس تک آئی۔

"تم جا رہے ہو؟"

وہ الجھنے سے اسے پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"تو پھر تم یہاں کرنے کیا آئے تھے؟"

"تم سے ملنے۔" وہ پھنکار کر بولا۔

"مجھ سے ملنے۔" طیب اس سے زیادہ پھنکارا۔

"تو اس سے نہیں؟" جس ڈیوڑھی میں وہ کھڑا تھا'

لنگڑاتے ہوئے طیب نے آگے بڑھ کر اس میں سے نکلتے ایک چھوٹے اندر کو دھنسے ہوئے دروازے کو ہاتھ بڑھا کر کھول دیا۔

اندر اندھیرا تھا۔ بہت اندھیرا۔ کیونکہ کوئی جلی ہوئی تیلیوں کو ماچس میں سے نکال نکال کر بجھی ہوئی لالٹین کو روشن کر رہا تھا۔ جس میں تیل تھا نہ لاٹ۔

"یہ مجھے پاکستان کے کیمپ میں ملی تھیں۔ ریڈیو سے ان کے شوہر عالی جاہ کے نام کے اعلانات ہر پندرہ منٹ بعد ہوتے تھے۔ ہندوستان خط لکھے کہ آ کر لے جائیں انہیں لیکن وہ صرف ان کی جلی ہوئی ہڈیاں لینے پر بضد رہے کہ گنگا میں بہا دیں۔ اب آئے ہو تو اسے آزاد کر دو یا اس کی ہڈیاں اس کے پرکھوں کو بھجوا دو۔ آگ لگانے کی تو اب ویسے ہی ضرورت نہیں رہی۔"

طیب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی چابی نکالی جو اس زنجیر کی تھی جو اس کے پیر میں پڑے تالے کی تھی۔

اندھیرا اتنا بڑھ گیا کہ اس نے طیب کو تھام لیا اور چابی کہیں نیچے گر گئی۔

"محبت جو خصلت ہوا کرتی ہے وہ قسمت نہیں ہوتی۔ نا اِس کی نا اُس کی۔"

وہ آگے بڑھا اور ان ہڈیوں کو دیکھنے لگا جنہیں اب آگ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ ویسے ہی جل رہی تھیں۔

جلتی چتا میں ہاتھ بڑھا کر اس نے شگن کو اس کے کان سے نوچ ڈالا۔ "لیکھ اب بدل جائیں گے۔ چڑھاوا لوٹ لیا۔"

وہ بنا پلٹے اتنی تیزی سے اندر کو دھنستے اس گھر سے نکلا جس میں پانچ لوگ اسے نفرت ـــــ سے دیکھ رہے تھے کہ رک جاتا تو دھنس جاتا۔

تین دن بعد طیب کا پہلا اور آخری تار ملا۔

"مجھے معلوم ہوتا کہ اس بالی کو اتارنے سے وہ آزاد ہو جائیں گی تو یہ کام بہت پہلے کر چکا ہوتا۔"

اور تین دن بعد وہ راکھ میں وہ ہڈیاں چننے لگا جو ہر روز اس کے اندر ڈھیروں ڈھیر پنپ جاتی تھیں۔ ☆☆